Date of Publication: 16-07-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 July 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 July 2013 ۲۲ تا ۲۸ جولائی ۲۰۱۳ء

Issue: 28, Vol.: 72 شمارہ نمبر: ۲۸، جلد نمبر: ۷۲

آرکاٹ میں اردو شاعری کا مفصل جائزہ لینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دبستانِ آرکاٹ کے تاریخی، سیاسی اور ادبی پس منظر پر بھی سرسری نگاہ ڈالی جائے۔ دکن کی عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے علی الترتیب 1686 اور 1687 میں زوال کے بعد مغل فرماں روا اورنگ زیب عالمگیر نے جنوب بعید کی ریاستوں پر اپنا تسلط جمانے کی ٹھانی، چناں چہ 1691 میں اورنگ زیب عالمگیر نے کرناٹک پائین گھاٹ کے حدود کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے نواب ذوالفقار خاں کو کرناٹک کا صوبیدار بنادیا۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی کے بہ قول کرناٹک پائین گھاٹ کے علاقے میں گنٹور، نلور، مدراس، چنگل پیٹ، جنوبی آرکاٹ، بارہ محل، سیلم، کوئمبتور، شمالی آرکاٹ اور ویلور شامل

دبستانِ آرکاٹ کا تاریخی، سماجی اور ادبی پس منظر

پہلی قسط

ڈاکٹر جاویدہ حبیب

اردو لکچرر، اکادمی آف اسلامک ریسرچ، ایس. آئی. ای. ٹی. کالج کیمپس، چینئی - ۶۰۰۰۱۸

تھے۔[1] یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کے مختلف علاقوں میں قدیم کرناٹک (صوبۂ مدراس) کا بڑا حصہ شامل تھا اور بقول ڈاکٹر افضل الدین اقبال "عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے شعرا اور ادبا میں کرناٹک کے باشندے بھی شامل تھے، چناں چہ نصرتی اور موسیٰ کو مختلف تذکرہ نگاروں نے کرناٹک کا باشندہ قرار دیا ہے"۔[2]

آرکاٹ تمل زبان کا لفظ ہے۔ تمل میں 'آر' ندی کو کہتے ہیں اور 'کاٹ' (کاڈ) کا لفظ جنگل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ نواب ذوالفقار علی خاں نے فتح کرناٹک کے دوران جب پالار ندی کے اطراف پھیلے ہوئے جنگل کو کٹوا کر اپنے خیمے نصب کیے تو اس تشکیل شدہ بستی کا نام 'آرکاٹ' پڑ گیا اور ایک مختصر سے عرصے میں یہاں گنجان آبادی والا ایک خوب صورت شہر وجود میں آیا۔ رفتہ رفتہ اس شہر کو محمد پور دار السرور کے نام سے بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔

نواب ذوالفقار جن کا پیدائشی نام محمد اسماعیل اور خطاب نصرت جنگ تھا، نواب اسد خاں آصف الدولہ کے فرزند تھے۔ ان کی والدہ کا نام مہر النساء بیگم تھا اور وہ نواب آصف خاں یمین الدولہ کی دختر تھیں۔[3] نواب ذوالفقار خاں نصرت جنگ 1656 میں تولد ہوئے اور 1692 میں مغل فرماں روا اورنگ زیب نے انھیں کرناٹک کا صوبیدار مقرر کیا تھا۔ نواب ذوالفقار کی جنگی فتوحات میں جنوبی آرکاٹ کے مضبوط قلعہ جنجی کی تسخیر ایک یادگار کارنامہ ہے، تو زک والا جاہی 'مآثر الامرا' میں اس قلعے کی فتح اور ترچنا پلی، تنجاور اور دوسرے علاقوں کے راجاؤں اور زمینداروں کی ذوالفقار سے اطاعت اور باج گزاری کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ قلعہ جنجی 6 شعبان 1109ھ (1698) کو طویل محاصرے اور مسلسل جنگ وجدال کے بعد فتح ہوا۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کا بیان ہے کہ جنوبی ہند میں ایک جنجی کا قلعہ ہی مضبوط قلعہ تھا جس پر مرہٹے قابض تھے۔ نواب ذوالفقار خاں نے 1693 میں اس کا محاصرہ کیا تھا اور پانچ سال کے بعد 1698 میں یہ قلعہ فتح ہوا۔ اس طرح جنوب کا تمام علاقہ مغلیہ سلطنت کے زیر اثر آ گیا۔[4]

نواب ذوالفقار خاں ایک فرض شناس عہدیدار اور تجربہ کار جنرل تھے۔[5] نہایت سلیم الطبع اور رحم دل انسان تھے۔[6] علما، فضلا، شعرا اور ادبا کی قدردانی میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ قدردانی اور سرپرستی کی توقع میں دور دراز ممالک سے شعرا اور اہل علم آرکاٹ میں یکجا ہونے لگے۔ نواب ذوالفقار خاں کے عہد میں آرکاٹ بزرگانِ دین اور صوفیا کا مسکن بنا ہوا تھا۔ 1115ھ (1703) میں اورنگ زیب نے نواب داؤد خاں پنی کو نواب ذوالفقار خاں کی جگہ آرکاٹ کا صوبیدار بنایا اور آخر الذکر نواب کو دہلی طلب کر لیا تھا۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے لکھا ہے کہ نواب ذوالفقار خاں 1124ھ (1713) میں آگرہ کے قریب ایک جنگ میں قتل کر دیے گئے۔[7]

نواب ذوالفقار خاں کے زیر سرپرستی جن صوفیا، علما اور شعرا کو آرکاٹ میں روحانی فیوض و برکات اور شعر و ادب کو عام کرنے کا موقع ملا اور انھوں نے اس دور میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی ان میں مشہور زمانہ صوفی سید شاہ حمید الدین المعروف بہ حمید اولیا بادشاہ گنجی، فارسی کے ممتاز سخن ور ناصر علی سرہندی (متوفی ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء)، محمد رضا قزلباش خاں امید (متوفی ۱۱۵۶ھ/۱۷۳۶ء) اور دکنی اردو کے صاحب دیوان ریختی گو شاعر سید میراں میاں خاں ہاشمی بیجاپوری (متوفی ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۸ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں مذکورہ بالا اصحاب کا سرسری تذکرہ کیا جاتا ہے۔

نواب ذوالفقار خاں نصرت جنگ کے دور میں اپنے وقت کے مشہور صوفی اور مذہبی رہنما سید شاہ حمید الدین اولیا قدس سرہٗ المعروف بہ شاہ گنجی حمید اولیا دہلی سے ہجرت کر کے گنجی پہنچے۔ ان کے روحانی فیوض اور اسلامی تعلیمات سے جنوبی ہند کے علاقے کو فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر افضل الدین کا بیان ہے کہ حضرت سید شاہ حمید الدین گنجی ہی میں دفن ہیں۔ ہر سال آپ کا عرس بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔[8]

مشہور فارسی شاعر ناصر علی سرہندی نواب ذوالفقار خاں کے عہد میں جب آرکاٹ پہنچے تو نواب موصوف نے اپنے دربار سے وابستہ کر لیا۔ 'مآثر الامرا' کے حوالے سے افضل الدین اقبال نے لکھا ہے کہ ناصر علی سرہندی نے ذوالفقار خاں نصرت جنگ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع پیش ہے:

اس شانِ حیدری ز جبین تو آشکار
نام تو در بزد کند کار ذوالفقار

نواب نے انھیں زر کثیر کے علاوہ سونے کی زنجیر فیل عطا کی تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا بیان ہے کہ ناصر علی نے اپنے قیام دکن کے دوران اردو غزلیں بھی کہی تھیں، وہ کہتے ہیں کہ قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے سقوط کے بعد مغلیہ دور میں شمال و جنوب کے درمیان حائل دیواریں منہدم ہو گئیں، چناں چہ لکھتے ہیں:

"اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد شمال و جنوب کے درمیان جو دیوار کھڑی تھی وہ دور ہو گئی تھی اور یہ دونوں علاقے گھر آنگن بن گئے تھے۔ فارسی کے مشہور شاعر ناصر علی دکن گئے تو وہ بھی دکنی اردو غزلیں کہنے لگے"۔

(تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی جلد دوم، حصہ اول، ص 25)

مرزا محمد رضا قزلباش خاں امید (۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء - ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء) ہمدان کے متوطن تھے۔ عہد بہادر شاہ اول کے آغاز میں اصفہان سے ہندوستان آئے، فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ مقامی ماحول سے متاثر ہو کر انھوں نے اردو میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا۔ 'گلزار ابراہیم' کے مولف کا بیان ہے کہ امید مملکت کرناٹک کے وارد کی حیثیت

سے ایک طویل عرصے تک آرکاٹ میں مقیم رہے۔ ؎

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب 'تاریخ ادب اردو' میں اطلاع دی ہے کہ امید جب ہندستان آئے تو نواب ذوالفقار خاں بہادر کی مدد سے قزلباش خاں خطاب اور منصب ہزاری پر سرفراز ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد نظام الملک آصف جاہ کے متوسل ہو گئے اور جب نظام الملک محمد شاہ کی طلبی پر 1150ھ میں دہلی گئے تو امید بھی ان کے ساتھ دہلی گئے اور ہمیشہ کے لیے وہیں کی خاک کا پیوند بن گئے۔ ؎ میر تقی میر اور ابراہیم خاں خلیل وغیرہ نے اپنے تذکروں میں امید کی طبیعت کی یار باشی، خوش خلقی، رنگینی صحبت اور رقص و موسیقی سے غیر معمولی رغبت و دل چسپی کا تذکرہ کیا ہے۔

سید میراں خان ہاشمی کا شمار علی عادل شاہ ثانی (1656-72) دور کے بلند پایہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ بیجاپوری عادل شاہی سلطنت کے زوال کے بعد ہاشمی نواب ذوالفقار خاں کی ادب نوازی اور شعر پروری کے چرچے سن کر آرکاٹ چلے آئے اور تاحیات انہی کے دربار سے وابستہ رہے۔

ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنے ایک تحقیقی مضمون 'ہاشمی کے غیر مطبوعہ قصیدے' مشمولہ 'دکنی شاعری تحقیق و تنقید' میں نواب

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

تیسری اور آخری قسط

ٹیگور، پریم چند اور ناول کی شعریات

قدوس جاوید

'نوکا ڈوبی' کا موضوع یہ ہے کہ ''پرانی اور فرسودہ اقدار کی کشتیوں پر سوار ہو کر زندگی کے دریا کو پار نہیں کیا جاسکتا''۔ لیکن ٹیگور کی مثالیت پسندی نے اس بیش قیمت موضوع کی کشتی کو ہی غرقاب کر دیا ہے۔ ناول کے کردار شروع میں قدرے جاندار اور فعال نظر آتے ہیں کیوں کہ آغاز میں یہ کردار مصنف کے نظریات سے آزاد فطری انداز میں اپنی شخصیت کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سرگرم عمل ہوتے ہیں، لیکن جلد ہی ٹیگور ان پر حاوی ہو جاتے ہیں اور ان کی حیثیت کٹھ پتلیوں کی سی ہو جاتی ہے جو ٹیگور کی تخیلی اور مثالی دنیا میں رقص کرتی ہیں۔ ناول کا ہیرو رمیش ایک دیہاتی ہندو گھرانے سے تعلق رکھتا ہے لیکن مغربی تعلیم نے اس کے غور و فکر میں نیا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ رمیش سماج کی فرسودہ رسوم و رواج کے خلاف بغاوت کے منصوبے باندھتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ رمیش کے تمام منصوبے محض خیالی، ہوائی قلعے ہیں وہ انہیں عملی جامہ پہنانے کی جرأت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ رمیش اپنے دوست یوگیندر کی بہن نلنی سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اپنی کم ہمتی اور بے عملی کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر پاتا اور اپنے والد کی خواہش پر فرسودہ رسم و رواج کے مطابق ہی ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے جسے وہ جانتا تک نہیں تھا۔ اسی طرح دوسرے موقعوں پر بھی مسائل اور مصائب سے نبرد آزما ہونے اور حالات کو اپنے حسب مرضی ڈھالنے کی بجائے ان سے راہ فرار حاصل کرتا ہے۔

'نوکا ڈوبی' کی ہیروئن نلنی ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے، جس کی تعلیم و تربیت مغربی طرز پر ہوئی اور جو کسی بھی موضوع پر پورے اعتماد کے ساتھ اظہار خیال کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، لیکن ٹیگور نے ناول کے اختتام تک آتے آتے نلنی کو جوگن بنا دیا ہے مصائب اور مسائل سے پُر زندگی سے دور رہنے والی جوگن۔ حالاں کہ ٹیگور چاہتے تو نلنی کو جہالت، پس ماندگی اور روایت پرستی کے اندھیروں کے درمیان سے طلوع ہوتے ہوئے جدید ہندستان کی ایک فعال اور متحرک عورت کے طور پر بھی پیش کر سکتے تھے جو اس عہد کی ضرورت تھی، لیکن ٹیگور کی مثالیت پسندی آڑے آگئی۔

اسی طرح ناول کی دوسری ہیروئن کملا کے کردار کو بھی زیادہ ہی مثالی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ اس طرح کہ کملا گوشت پوست کی نوجوان عورت سے زیادہ، بے بس، جذبات سے عاری، پتھر کی تراشی ہوئی دیوی نظر آتی ہے۔ کملا اپنے شوہر کے گھر میں ایک خادمہ کی طرح رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہر طرح کی ناانصافی ہوتی ہے لیکن وہ کبھی کوئی حرف شکایت بھی اپنی زبان پر نہیں لاتی۔ آخر کار صبر و ایثار رنگ لاتا ہے اور اس کا بچھڑا ہوا شوہر مل جاتا ہے۔ اس طرح ٹیگور اپنا تخلیقی سفر شروع تو کرتے ہیں ایک عظیم مقصد، ایک زرخیز موضوع کو لے کر، لیکن حقائق زندگی کے شعلوں سے دامن بچانے کی فکر اور تخیلی و تصوراتی جہانوں کی سیر کا شوق انہیں راہ سے بے راہ کر دیتا ہے اور وہ ناول میں فنی و فکری اعتبار سے کوئی جدت پیدا کرنے کی بجائے فرسودہ تصوریت، مثالیت اور اخلاقیات کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر قارئین کو صبر و ایثار جیسی باتوں کا درس دے کر چپ ہو جاتے ہیں۔

ٹیگور کی طرح شرت چندر بھی اپنے ناولوں میں دیہی و قصباتی زندگی کے سماجی، مذہبی اور معاشی مسائل پیش کرتے ہیں، لیکن عشق و محبت، جنسیت اور جذباتیت کی آنچ کے ساتھ۔ یہ چیزیں ان کے ناولوں میں دل چسپی اور جذباتی کشش تو ضرور پیدا کرتی ہیں لیکن اس سے ان کے فن کی عظمت مجروح ہوتی ہے۔ شرت چندر کے کردار بھی مظلوم ہیں، لیکن بے عمل بھی... اور اس کی وجہ ٹیگور ہی کی طرح شرت چندر کی مثالیت پسندی ہے۔ اگر ان کے کردار فعال ہوتے تو ان کی جد و جہد شرت چندر کے فن میں مزید رس پیدا کرنے کا موجب بنتی لیکن المیہ یہ ہے کہ ان کے مظلوم اور بے عمل کرداروں کے آنسو قارئین کی ہمدردیاں تو بٹور لیتے ہیں لیکن شرت چندر کے فن کی چمک کو ماند کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں، مثال کے طور پر شرت چندر کے ناول 'چندر ناتھ' کے چندر ناتھ اور سریو، ناول 'پنڈت جی' کے بندرابن اور کسم ذات پات اور اونچ نیچ کے مسائل میں الجھے ہوئے کردار ہیں لیکن یہ ان مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کر کے حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے اور زندگی کی حقیقی مسرت حاصل کرنے کے بجائے بزدلانہ بے شرمی کے ساتھ خود اپنے آپ کو ہی حالات کے مطابق ڈھال کر اپنے آپ کو مستقل ذہنی عذاب میں مبتلا رکھتے ہیں، مثلاً ناول 'چندر ناتھ' کے ہیرو چندر ناتھ کو ہی لیں، چندر ناتھ ایک اعلا ذات کا زمیندار ہے۔ ایک بار کاشی میں اس کی ملاقات سریو سے ہوتی ہے جو ایک غریب ماں کی بے سہارا لڑکی ہے۔ چندر ناتھ سریو سے شادی کر کے اسے اپنے گھر لے آتا ہے، کچھ عرصہ بعد اچانک چندر ناتھ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ سریو کی ماں کے گاؤں کی ایک کمتر ذات کے شخص کے ساتھ تعلقات رہے تھے۔ چندر ناتھ کے قدامت پسند خاندان میں اس انکشاف پر بڑا ہنگامہ ہوتا ہے اور سریو کے ساتھ اچھوتوں کے جیسا برتاؤ کیا جانے لگتا ہے۔ لوگ اس کے ہاتھ کا چھوا کھانا چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ سریو کے اس گھر میں آنے سے سب کا 'سروناش' ہو گیا ہے۔ اس گھر میں نچلی ذات کے لوگوں کے ہاتھ کا چھوا کھانا ممنوع تھا۔ لوگ ہر حال میں اپنی نسلی برتری برقرار رکھنا چاہتے تھے اور سریو کے اس گھر میں آجانے سے ''سب کی ذات بھی گئی اور دھرم بھی گیا''۔ لوگوں نے چندر ناتھ کو مجبور کیا کہ وہ سریو کو گھر سے نکال دے۔ چندر ناتھ کو خود بھی انجانے میں ہو جانے والے اس 'پاپ' سے بڑی پریشانی تھی لیکن وہ سریو سے بے پناہ محبت بھی کرتا تھا۔ چناں چہ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آخر کار ذات پات کا جھوٹا بھرم محبت اور فرض پر غالب آجاتا ہے اور چندر ناتھ چاہتے ہوئے بھی حالات کے آگے گھٹنے ٹیک کر بالآخر اپنی بیوی، اپنی محبوبہ سریو کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ لیکن چندر ناتھ سریو کو گھر سے نکال کر خود بھی چین سے نہ بیٹھ سکا۔ ذہنی کشمکش اور احساس جرم کی آگ میں جلتا وہ خود بھی ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ زمین جائداد سب سے بے پروا۔ کئی سال بیت گئے آخر کار چندر ناتھ کے خاندان والوں کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ذات پات کے کھوکھلے بھرم سماج کے جھوٹے خوف اور فرسودہ اقدار کی بنا پر ان سے ایک معصوم پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ چناں چہ خاندان والوں کے کہنے پر ہی چندر ناتھ ایک دن سریو کو پھر سے اپنے گھر لے آتا ہے۔

ذات پات، اونچ نیچ اور نسلی امتیاز کا مسئلہ اپنے عہد کے پس منظر میں بڑی اہمیتوں کا حامل رہا ہے۔ لیکن اس انتہائی اہم، وسیع اور زرخیز موضوع کے ساتھ شرت چندر انصاف نہیں کر سکے۔ ناول میں جذباتیت اور رومانیت دل چسپی اور کشش پیدا کرنے کا سبب تو بنتی ہے لیکن توازن شرط ہے جب کہ شرت چندر کے فن میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جو اس ناول کو ایک عظیم ناول بنانے کا موجب بنتی۔ پریم چند کی طرح شرت چندر بھی غالباً گاندھی جی کے زیر اثر ذات پات کے بھرم کو توڑنا چاہتے ہیں لیکن ان کے کردار سماج سے بغاوت کرنے، فرسودہ روایات و معتقدات کو توڑنے کی ہمت نہیں رکھتے بلکہ سماج اور سماجی بندھنوں کے آگے مجبور اور بے بس نظر آتے ہیں لیکن کردار نگاری کے اعتبار سے کمزور ہونے کے باوجود موضوع اور مقصدیت کے نقطہ نظر سے اس ناول کی اہمیت ہے کیوں کہ جس عہد میں یہ ناول لکھا گیا اس عہد میں ہندستانی معاشرے میں ذات پات اونچ نیچ کی مختلف سماجی برائیوں کو جنم دے رہی تھیں اور اس طرح ہندستانی معاشرے کی بیداری اور ایک نئے آزاد، خود مختار اور خوش حال ہندستان کی تشکیل کی راہ میں رکاوٹیں

کمزوری ہورہی تھیں، چناں چہ ہندستانی معاشرے کو اس طرح لعنتوں سے پاک کرنے کے لیے سرسید، مہاتما گاندھی، رام موہن رائے وغیرہ نے جو کام سماجی سطح پر کیا، پریم چند، ٹیگور اور شرت چندر وغیرہ نے وہی فریضہ ادبی سطح پر اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے انجام دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس ضمن میں جتنی کامیابی پریم چند کو ملی، ٹیگور اور شرت چندر کو نصیب نہ ہوئی۔

شرت چندر نے اپنے ناولوں میں بال ودھوا، ذات پات، اونچ نیچ کے علاوہ دیہاتوں کی غریبی اور پس ماندگی وغیرہ موضوعات کو پیش کرتے ہوئے اکثر اس بات پر زور دیا ہے کہ ساری برائیوں کی جڑ تعلیم کی کمی ہے۔ اس طرح شرت چندر کے بعض ناولوں میں مثالیت تصوریت کے ساتھ ساتھ مقصدیت بھی شامل ہوجاتی ہے اور عشق و محبت کی رنگ آمیزی تو شرت چندر کا بنیادی امتیاز تو ہے ہی۔ اور یقینی طور پر ان تمام باتوں نے مل جل کر شرت چندر کے ناولوں کو بے حد دل چسپ بنادیا ہے۔ ٹیگور اور پریم چند کے ناولوں سے بھی زیادہ دل چسپ اور پُرکشش، لیکن پریم چند کو بہ حیثیت مجموعی ناول نگار کے طور پر ٹیگور اور شرت چندر دونوں پر برتری حاصل ہے کیوں کہ ٹیگور اور شرت چندر نے جہاں تخیلی اور تصوراتی واقعات اور کرداروں کی مدد سے ہندستانی معاشرے میں اصلاح اور بیداری لانے کی کوشش کی ہیں پریم چند نے ہندستانی معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں اور سامنے کے حقیقی واقعات کو پیش کرکے اس ملک کی تقدیر بدلنے کی کوشش کی اسی لیے معاشرتی اصلاح اور قومی آزادی کے سلسلے میں جو خلوص اور جو سچائی ہمیں پریم چند کے یہاں ملتی ہے ٹیگور اور شرت چندر کے یہاں اس انداز میں نہیں ملتی۔ شرت چندر نے معاشرے کی فرسودہ روایات کو ختم کرنے اور خصوصاً عورتوں کے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ دی ہے لیکن انھوں نے کبھی بھی معاشرہ یا سماج کے تئیں پریم چند کی طرح Committed ہونے کا انداز اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں سماج کو مانتا ہوں لیکن اسے میں دیوتا نہیں مانتا"۔ واقعہ یہ ہے کہ شرت چندر ادب کے تخلیقی و جمالیاتی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ "آرٹ انسان کی کائنات ہے وہ نیچر نہیں۔ دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے اور کافی گندی باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں، وہ کسی بھی حالت میں ادب کا مواد نہیں۔ ہو بہو نقل فوٹو گرافی ہوسکتی ہے لیکن کیا اسے ہم فنی تصور کہہ سکتے ہیں؟ دنیا میں جو کچھ سچ مچ وقوع پذیر ہورہا ہے اسے ادب کے آلات (Tools) ماننے پر سچ ہوسکتا ہے لیکن صرف سچ یا سچائی ہی ادب نہیں۔ ناول نگار جزوی طور پر، اتفاقیہ طور پر مورخ ہوسکتا ہے لیکن اس کے ناول کے ساتھ سماجی حقائق کا تھوڑا بہت رشتہ ہونے کے باوجود بالآخر اس کی ذمہ داری مورخ یا ماہر سماجیات سے زیادہ ہوتی ہے اور اس ذمہ داری کے دائرے خالصتاً فنی تقاضوں اور محاسن کا احاطہ کرتے ہیں"۔ بنگلہ ادب اس اعتبار سے ہندستان کی دیگر زبانوں کے ادب سے ایک قدم آگے ہی ہے۔ خالصتاً ادب کے تئیں بنگلہ ادیبوں کے Commitment ہی کے سبب بنگلہ ادب سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جدید ادبی رجحانات اور تجربات کا مرکز رہا ہے۔ اب یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ جن جدید رجحانات اور تجربات کو بنگلہ ادب اور دیگر ہم عصر ادبیات میں اپنایا گیا وہ وقت کے ترازو پر پورے اتر کر کھرے ثابت ہوئے ہیں یا کھوٹے، کیوں کہ کم و بیش ہر زبان کے افسانوی ادب میں ایک بار پھر انھی روایات اور قدروں کی طرف مراجعت کا رجحان پیدا ہوچکا ہے جنھیں ہم فرسودہ قرار دے کر ترک کرچکے تھے، لیکن ادب کی سماجی اہمیت کے پیش نظر ناول اور افسانے کی جن روایات اور قدروں کی بازیافت کی کوشش آج کی جارہی ہے وہ یقینی طور پر شرت چندر اور ٹیگور سے زیادہ پریم چند کے ناولوں کی روایات اور اقدار ہیں۔ اور پریم چند کی روایات اور اقدار نے تمام لسانی حصار توڑ کر مغرب اور تاحال ہندستانی ادبی روایات کی شکل اختیار کرلی ہے اور اس کی اہم ترین وجہ پریم چند کا سماجی شعور ہے۔ پریم چند نے اپنے عہد کے سماجی مسائل کے پیش نظر جو خدشات ظاہر کیے تھے وہ آج بھی صد فیصد صحیح ثابت ہورہے ہیں۔ انھوں نے ذات پات، بھوک اور افلاس کے خاتمے کے لیے جس نوع کے سماجی نظام کے قیام کی ضرورت پر زور دیا تھا وہ آج بھی قومی رہنماؤں کو دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ پریم چند نے جس استحصالی نظام کے خلاف آواز بلند کی تھی وہ آج بھی قائم ہے۔ سامراجی استحصال کی جڑیں آج بھی مضبوط و مستحکم ہیں اور ملک کا نودولتیا طبقہ اسے زیادہ تنومند و توانا کررہا ہے اور المیہ یہ ہے کہ ملک و قوم کا اقتدار ابھی اسی سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ 'ہوری' ('گئودان') گھاسی رام ('سدگتی') آج بھی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے استحصال کا شکار ہورہے ہیں، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مررہے ہیں۔ 'ہوری' آج بھی ہندستان کے کروڑوں کسانوں، مزدوروں کا نمائندہ ہے اور ہمارے کسانوں کے اہم مسائل آج بھی زمین، بیل، بیج، قرض، سود کی بڑھی ہوئی شرح، قرض لینے اور دینے کے طریقے، زمیندار، استحصال، بے دخلی، قرقی وغیرہ ہیں۔ 'ہوری' ان تمام مسائل سے یکے بعد دیگرے گزرتا ہے۔ 'ہوری' دو بیگھہ زمین کی کاشت کرکے بھی فاقہ مست تھا لیکن آخرکار اسے اپنی زمین سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ جن سرمایہ دارانہ سازشوں اور بے رحمانہ چالوں کا شکار ہوری ہوا، ان سے آج بھی کروڑوں کسان دوچار ہیں۔

"منگرو ساہو سے آج پانچ سال ہوئے بیل کے لیے ساٹھ روپے لیے تھے، اس میں سے ساٹھ روپے دے چکا تھا، لیکن وہ ساٹھ روپے جیوں کا تیوں برقرار تھے۔ اس میں سے تیس روپے لے کر آلو بوئے تھے۔ آلو تو چور لے گئے تھے اور ان تیس کے ان تین برسوں میں سو ہوگئے"۔ ہوری کی اس حالت سے اس مہاجنی استحصال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو کسانوں کا خون چوستا ہے، لیکن اتنے ہی پر بس نہیں تھا۔ یہ مہاجنی نظام کس کس طرح اپنے جال پھیلاتا ہے اس کا بھی پریم چند نے پردہ فاش کیا ہے۔ کسانوں کو ادھار دینے سے پہلے مہاجن "پکا کاغذ لکھتے تھے۔ نذرانہ علاوہ لیتے تھے۔ دستوری الگ اور اسٹامپ کی لکھائی الگ"۔ بڑی محنت سے مرکھپ کر ہوری نے گنے کی فصل تیار کی، لیکن جب فصل کاٹنے کا وقت آیا تو ہوری کو پتہ چلا کہ اس کی زمین ہی اب اس کی نہیں "کب دعویٰ دائر ہوا، کب ڈگری ہوئی، اسے بالکل پتہ نہ چلا۔ اور اُدھر ڈیڑھ سو روپے میں نیلام بھی ہوگئی اور بولی ہوگئی منگرو ساہو کے نام"۔ اور ہوری آخرکار اسی استحصال کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ گئودان میں ہوری کے کردار کے توسط سے پریم چند نے یہ تاثر دیا ہے کہ جب تک معاشرے سے اس دوہرے تہرے استحصال کا خاتمہ نہیں ہوگا، ہندستان کے عوام خوش حال نہیں ہوسکیں گے۔ اور آج پریم چند کے اس نقطۂ نظر کو نہ صرف شدت سے محسوس کیا جارہا ہے بلکہ اس پر عمل کرنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے۔

پریم چند اپنے ناولوں میں ان استحصالی قوتوں سے بار بار یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ عوام کی اس بگڑی حالت پر نہ جائیے۔ عوام میں ان استحصالی قوتوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ موجود ہے اور اس کی ایک دل چسپ مثال 'گئودان' میں ہی ملتی ہے۔ ہولی کے موقعے پر گاؤں کے نوجوان اپنا استحصال کرنے والے زمینداروں، ساہوکاروں کی نقل کرتے ہیں۔ ایک منظر ہے جب ایک کسان ٹھاکر جھنگر سنگھ کے پیر پکڑ کر رونے لگتا ہے، ٹھاکر جھنگر سنگھ بڑی مشکلوں سے روپے قرض دینے پر راضی ہوتے ہیں۔ جب کاغذ لکھ جاتا ہے اور کسان کے ہاتھ میں پانچ روپے دیے جاتے ہیں تو وہ کسان چکرا کر دکھ بھرے لہجے میں کہتا ہے:

"یہ تو پانچ ہی ہیں مالک؟
پانچ نہیں دس ہیں۔ گھر جاکر گننا
نہیں سرکار، پانچ ہیں
ایک روپیہ نذرانے کا ہوا یا نہیں؟
ہاں سرکار
ایک تحریر کا؟
ہاں سرکار
ایک کاغذ کا؟
ہاں سرکار
ایک دستوری کا؟
ہاں سرکار
ایک سود کا؟
ہاں سرکار
پانچ نقد، دس ہوئے کہ نہیں
ہاں سرکار۔ اب یہ پانچوں بھی میری طرف سے رکھ لیجیے
کیسا پاگل ہے؟
نہیں سرکار! ایک روپیہ ٹھکرائن کا نذرانہ ہے۔ ایک روپیہ بڑی ٹھکرائن کا، ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کے پان کھانے کا ہے، ایک بڑی ٹھکرائن کے پان کھانے کا، باقی بچا ایک وہ آپ کے کریاکرم کے لیے"۔

اسی طرح ہندستانی معاشرے میں ہریجنوں اور اچھوتوں کا مسئلہ پریم چند کے عہد میں بڑا سنگین تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اب اچھوتوں اور ہریجنوں کو مندروں میں جانے اور کنواں سے پانی لینے میں ہر جگہ روکا نہیں جاتا۔ ان کے ساتھ تعلیمی اداروں اور ملازمتوں میں رعایت بھی دی جاتی ہے لیکن مسئلہ آج بھی موجود ہے حل نہیں ہوا ہے۔ "دلت تحریک" اس کی زندہ مثال ہے۔ پریم چند نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

"ہریجنوں کا مسئلہ صرف مندروں میں داخلے سے حل ہونے والا نہیں ہے۔ اس مسئلے کی اقتصادی دشواریاں مذہبی دشواریوں سے کہیں زیادہ سنگین ہیں۔ اگر ہم اپنے ہریجن بھائیوں کو اٹھانا چاہتے ہیں تو ہمیں ایسے ذرائع پیدا کرنے ہوں گے جو ان کے اٹھنے میں مدد دیں۔ ان کے لیے وظائف اور تعلیمی ادارے ہونے چاہئیں۔ نوکریاں دینے میں ان کے ساتھ تھوڑی رعایت کرنی چاہیے"۔

واقعہ یہ ہے کہ شرت چندر اور ٹیگور بنیادی طور پر صرف اور صرف ادیب ہیں لیکن پریم چند اپنے ناولوں، افسانوں اور مضامین میں ایک عظیم فکشن نگار کے ساتھ ساتھ ایک سماجی مفکر (Social Thinker) بھی نظر آتے ہیں، لیکن پریم چند نے سماج کی ہو بہو نقل بھی نہیں اتاری ہے، اسی لیے ان کے ادب کو فوٹو گرافی نہیں کہہ سکتے۔ واقعتاً پریم چند نے ہوری، گوبر، دھنیا (گئودان) صوفیہ، سورداس (چوگانِ ہستی) سمن (بازارِ حسن) دیوی دین، رام ناتھ (غبن) امرکانت، محمد سلیم (میدانِ عمل) کے حوالے سے اپنے عہد کی عصری حسیت اور سماجی مسائل کو بڑی کامیابی سے نئی شکلوں میں منتقل کیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ عظیم تخلیقی فن کار وہی ہے جو زندگی کی کوری نقالی اور عکاسی کے بجائے زندگی کی تخلیق جدید کرتا ہے یہ ایک ایسی نمایاں صفت ہے جو پریم چند کو شرت چندر اور ٹیگور سے ہی نہیں ہندستان کے تمام فکشن نگاروں سے ممتاز و افضل بناتی ہے۔ دراصل پریم چند کی انفرادیت اس میں مضمر ہے کہ وہ واحد ادیب ہیں جنھوں نے اپنے عہد کے سماجی نظام اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانی نفسیات، مزاج اور رویے کے درمیان ایک رشتہ قائم کیا اور یہ کام وہی کرسکتا ہے جو اپنے سماج کا گہرا شعور رکھتا ہو۔ معاصر ناول کی شعریات کی تشکیل جدید کے ضمن میں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

بہ شکریہ سہ ماہی 'نیا ورق' ممبئی
شمارہ نمبر: 39

●●●

اردو دُنیا

پیلی بھیت شہر کے کسی بھی ڈگری کالج میں اردو کی تعلیم کا بندوبست نہیں

پیلی بھیت (۱۸رجولائی)۔ آزادی ملک کے 65 سال گزر جانے کے بعد بھی شہر کے کسی بھی ڈگری کالج میں اردو کی درس و تدریس کا بندوبست نہیں ہے جس کی وجہ سے ڈگری درجات میں اردو زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو زبردست دشواری کا سامنا ہے۔ گزشتہ 30 سالوں سے مسلسل ہو رہے مطالبات کے باوجود بھی محکمۂ اعلا تعلیم، یونیورسٹی انتظامیہ یا اردو کے فروغ کا دعویٰ کرنے والی سیاسی جماعتوں نے اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہر کے نصف درجن ڈگری کالجوں میں کہیں بھی اردو کی تعلیم کا نظم نہیں ہے جب کہ شہر اور قرب و جوار کے مسلم علاقوں میں ایک درجن سے زیادہ انٹر کالجوں میں اردو کی باضابطہ تدریس ہوتی ہے۔ ہر سال سیکڑوں طلبہ و طالبات اردو مضمون کے ساتھ انٹر درجات کا امتحان پاس کرتے ہیں۔ بورڈ امتحان ۱۳-۲۰۱۲ میں ضلع کے مختلف انٹر کالجوں سے 800 سے زائد طلبہ و طالبات نے اردو مضمون کے ساتھ انٹر امتحان پاس کیا مگر ڈگری کالجوں میں اردو کی درس و تدریس نہ ہونے کی وجہ سے ڈگری تعلیم کے دوران اردو مضمون چھوڑ دینا طلبہ و طالبات کی مجبوری ہے۔ معلمین اردو بے روزگار اساتذہ تنظیم کے ضلع صدر شریف انصاری نے بتایا کہ وہ گزشتہ گیارہ سالوں سے ڈگری کالجوں میں اردو کی درس و تدریس شروع کرانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ انھوں نے ضلع مجسٹریٹ راجیب چوہان کی مدت کار میں یونیورسٹی انتظامیہ سے منظوری حاصل کرنے والا فارم خرید کر کالج انتظامیہ کو دیا تھا مگر اس وقت کالج انتظامیہ کے ذریعے فائل تیار کرنے میں تاخیر کی گئی۔ اسی دوران ضلع مجسٹریٹ کا تبادلہ ہو گیا اور کالج میں نئے ریسور کی تعیناتی ہو گئی۔ اس کے بعد کالج ملازمین کے ذریعے اردو درس و تدریس کی منظوری والی فائل سرد خانے میں ڈال دی گئی۔ انھوں نے بتایا کہ جون کے آخر میں انھوں نے کالج انتظامیہ سے مذکورہ فائل کے بارے میں معلومات حاصل کی تو ملازمین نے فائل سے عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ دوسری جانب سماج وادی پارٹی کی حمایت کرنے والی تنظیم ائمۂ مساجد کے اراکین سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا کہ اردو داں ہونے کے ناطے کیا آپ کی کوئی ذمہ داری ہوتی ہے کہ مقامی ڈگری کالجوں میں اردو کی درس و تدریس شروع کرانے کے لیے آپ اس حکومت سے بات کریں جس کی دوران انتخاب آپ نے حمایت کی تھی تو تنظیم ائمۂ مساجد کے حافظ اصغر نور، حافظ ذوالفقار علی قادری اور حافظ سراج شمسی نے کہا کہ عید الفطر کے بعد مقامی ایم ایل اے اور ریاستی وزیر مملکت حاجی ریاض احمد کے ہمراہ وزیر اعلا سے ملاقات کی جائے گی اور مقامی ڈگری کالجوں میں اردو کی درس و تدریس شروع کرانے کے لیے کوشش کی جائے گی۔

(انقلاب۔ دہلی)

80 فیصد طلبہ کی مادری زبان اردو ہے لیکن ٹیچر نہیں

رام پور (۱۵رجولائی)۔ تحصیل سوار کے گاؤں ترپت نگر میں واقع گورنمنٹ گرلز انٹر کالج میں اردو پڑھانے کے لیے ٹیچر نہیں ہے جب کہ درجہ 9 سے 12 تک کی طالبات کی بڑی تعداد کے پاس اردو ہے۔ اس سلسلے میں تحصیل سوار کی سینئر بار ویلفیئر ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری محبوب علی نے صوبائی وزیر تعلیم کو ایک عرض داشت بھیجی ہے جس میں انھوں نے ترپت نگر کے گورنمنٹ گرلز انٹر کالج میں اردو ٹیچر کی تقرری کا مطالبہ کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کالج میں داخلہ لینے والی 80 فیصد طالبات کی مادری زبان اردو ہے، اس کے باوجود کالج میں اردو ٹیچر نہیں ہے۔ گزشتہ سیشن میں نویں سے بارہویں درجے تک کی لڑکیوں نے اردو مضمون کو کسی نہ کسی طرح پڑھ کر امتحان پاس کیا۔ انھوں نے مطالبہ کیا ہے کہ اسکول میں اردو ٹیچر کی تعیناتی ہر حال میں کی جائے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

ضلع ہاسن کے اردو اسکولوں کا ڈائرکٹوریٹ کی طرف سے جائزہ

ہاسن (۱۹رجون)۔ شاہتا راج (ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ آفس بنگلور) کی زیر صدارت بمقام ڈی ڈی پی آئی آفس میں ضلع کے تمام اردو اور سرکاری اسکولوں کا مکمل جائزہ لیا گیا جس میں ضلع کے تمام بی ای اوز، بی آر سی، اردو ای سی اوز اور اردو سی آر پی اپنے تمام ضروری دستاویزات کے ساتھ حاضر رہے اور شاہتا راج نے ایک کے بعد دیگرے تعلقہ کا مکمل جائزہ لیا۔ بسوا راج ڈی ڈی پی آئی ہاسن نے موصوف کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ شاید پہلی بار ضلعی سطح پر اس طرح کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور مسائل کو حل کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ سید حفیظ الرحمن ای سی او اردو، شمس اللہ ای سی او ہولے نرسی پور، سید اسد حسینی سی آر پی سکلیشپور، سید کاظم حسینی سی آر پی بیلور، عارف انصاری سی آر پی چنرائے پٹن، سید نظام الدین شاہ قادری سی آر پی ہولے نرسی پور اور ایک ارکلگوڈ کے سی آر پی نے اپنے اپنے مسائل حل کرنے کی سعی کی اور ڈائرکٹر نے چند ایک مسئلوں کا آفیسرس کی موجودگی میں حل پیش کیا۔

(سالار۔ بنگلور)

مسلم اکثریتی علاقہ کانٹھ میں اردو اسکول کی حالت زار

شاہجہاں پور (۳رجولائی)۔ قصبہ کانٹھ کے اسلامیہ پرائمری اسکول میں گزشتہ دو برسوں سے کسی ٹیچر کی تعیناتی نہیں کی گئی ہے۔ اسکول شکشا متروں کے سہارے ہی چل رہا ہے۔ یہاں اردو میڈیم سے تعلیم دینے کا نظام بھی ٹھپ پڑا ہے۔ 70 فیصد مسلم آبادی والے قصبہ کانٹھ میں اردو میڈیم کی تعلیم کے لیے صرف ایک اسلامیہ پرائمری اسکول قائم ہے جس میں پرنسپل عشرت علی کے سبکدوش ہونے کے بعد سے اب تک دو سال گزر جانے کے باوجود کسی اردو اساتذہ کی تقرری نہیں کی گئی ہے جس سے مسلم طلبہ اردو مضمون کی پڑھائی سے پوری طرح محروم ہیں۔ اسکول میں درس و تدریس کا ذمہ دو خاتون شکشا متروں کے کاندھوں پر ہے۔ قابل غور ہے کہ اسکول میں قریب 279 مسلم طلبہ ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ اردو ٹیچر نہ ہونے سے بچوں کے سرپرست کئی مرتبہ اس سلسلے میں اعلا تعلیمی افسران سے اردو ٹیچر کی تقرری کا مطالبہ کر چکے ہیں مگر اب تک محکمۂ بیسک تعلیم کے افسران نے اس جانب کوئی سنجیدگی نہیں دکھائی ہے۔ مگر پنچایت کانٹھ کے وارڈ ممبر بیگم، سراج محمد، جمشید علی، واجد، مجیب، صادق، منے، بابو وغیرہ نے بی ایس اے متوج ورما سے اردو ٹیچر کی اسلامیہ پرائمری اسکول میں تقرری کرنے کا مطالبہ کیا۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

لال بابا کالج میں شعبۂ اردو کا قیام انجمن ترقی اردو کی دوسری بڑی کامیابی

ہوڑہ، مغربی بنگال (۲۳رجون)۔ لال بابا کالج ہوڑہ میں شعبۂ اردو کا قیام انجمن ترقی اردو کی دوسری بڑی کامیابی ہے۔ اس سے قبل این ڈی کالج میں آنرز کے ساتھ شعبۂ اردو کا قیام بھی انجمن ترقی اردو ضلع ہوڑہ کی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ لال بابا کالج، ہوڑہ گرلس کالج، آندول کالج اور ڈی پی کالج میں اردو آنرز کے لیے انجمن کی کاوشوں سے سب لوگ واقف ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں ہوڑہ مسلم ہائی اسکول تکیہ پاڑہ میں ایک تعلیمی کنونشن انجمن ترقی اردو ہوڑہ کے زیر اہتمام ہوا تھا۔ اس میں اردو آنرز کے ساتھ اردو شعبے قائم کرنے کی مانگ کی گئی تھی۔ ۲۰۱۲ء میں اختر جاوید کی صدارت میں انجمن کی جانب سے مدھیامک اور ہائر سکنڈری کے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک جلسہ حلیم النساء اسکول پیل خانہ میں ہوا تھا۔ اس جلسے میں بھی پیل خانہ اور کھسوری کے طلبہ و طالبات کی سہولت کے کے لیے لال بابا کالج میں اردو شعبے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ۲۴ فروری ۲۰۱۲ء کو ہوڑہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک ڈیپوٹیشن انجمن کی جانب سے دیا گیا، اس میں ایم۔ اے۔ قائم ملک، ڈاکٹر واصف اختر، محمد اشفاق حسین خاں، محمد نعمان، اسماعیل پرواز اور محمد مسلم شامل تھے۔ ان کے علاوہ ۱۹ اردسمبر ۲۰۱۲ء کو کھسوری موڑ پر مولانا آزاد سبھا کمیٹی ہوڑہ کی جانب سے ایک جلسے میں لال بابا کالج میں اردو شعبہ قائم کرنے کی مانگ کی گئی تھی۔ جلسے میں جاوید احمد خاں (وزیر برائے فائر سروسز اور قدرتی آفات) کو میمورنڈم بھی دیا گیا تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وزیر تعلیم سے اس سلسلے میں گفتگو کریں گے۔ اب جا کر ان تمام حضرات کی کوششوں سے لال بابا کالج میں اردو کا شعبہ قائم ہوا ہے۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

اردو نصابی کتب کی عدم فراہمی پر تنقید

حیدرآباد (۱۴رجون)۔ تنظیم فروغ اردو زبان آندھرا پردیش کے صدر محمد عبدالصمد اور اراکین عاملہ محمد کمال احمد، میر ماجد علی ریحان، محمد اقبال احمد، محمد ایاز الدین، محمد علیم الدین، محمد واجد علی اور محمد عبدالقیوم نے اپنے مشترکہ صحافتی بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ جلد سے جلد اردو میڈیم کے طلبہ کے لیے مفت درسی کتب کی تقسیم عمل میں لائیں۔ ۱۴-۲۰۱۳ء تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ تلگو اور انگلش میڈیم کی کتب طلبہ کی تعداد سے کہیں زیادہ فراہم کی گئی ہیں۔ لیکن اردو میڈیم کی کتب کا فقدان ہے۔ یہ دوغلی کیوں روا رکھی گئی ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ تمام میڈیم کو ایک نظر سے دیکھے۔ وقت پر درسی کتب دستیاب نہ ہو تو تعلیم کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اردو زبان کے فروغ کے لیے حکومت بلند بانگ دعوے اور اعلانات کرتے ہوئے اردو عوام کو صرف تسلی دیتی رہی ہے۔ اردو اسکولوں میں تعلیمی سہولتیں موجود نہیں ہیں اور یہ اسکولس کئی مسائل سے دوچار ہیں۔ اگر درسی سہولیات نہ ہوں تو طلبہ کی تعلیمی ترقی کیسے ممکن ہے۔ نہ درسی کتب کی فراہمی ہے نہ بیت الخلا کا نظم ہے۔ نہ پینے کے لیے پانی، نہ آمد و رفت کی سہولتیں ہیں، نہ وقت پر یونیفارم دیے جاتے ہیں، نہ ٹھیک طور پر دوپہر کے کھانے کا انتظام ہے۔ ہر اسکول میں مضمون واری اساتذہ کی کمی ہے۔ ان مسائل سے دوچار طلبہ کی کس طرح جسمانی، ذہنی اور تعلیمی نشو و نما ہو سکتی ہے۔ آخر کب تک حکومت اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک کرتی رہے گی۔ ڈاکٹر شیلجا ناتھ (وزیر تحتانوی تعلیم)، کے پارتھا سارتھی (وزیر وسطانوی تعلیم)، این کرن کمار ریڈی (وزیر اعلا حکومت آندھرا پردیش) سے تنظیم پرزور مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اردو کے تمام مسائل کو حل کرتے ہوئے مساویانہ سلوک کا ثبوت دیں ورنہ محبان اردو خاموش نہیں رہیں گے۔

(منصف۔ حیدرآباد)

اردو وفد کی وزیر اعلا اور ملائم سنگھ یادو سے ملاقات

لکھنؤ (۱۳ جولائی)۔ نئی تعلیمی مرکز کے سکریٹری جنرل عبدالنصیر ناصر نے سپا دفتر میں پارٹی کے سربراہ ملائم سنگھ یادو کو ایک عرض داشت سونپی، جس میں اردو اور اقلیتوں کے تعلق سے ان کی قیادت والی سابقہ حکومت میں ہوئے کاموں اور وعدوں کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ اس موقع پر وہاں پارٹی دفتر میں وزیر اعلا اکھلیش یادو، کابینی وزیر شیو پال سنگھ یادو نیز بلرام یادو وغیرہ بھی موجود تھے۔ میمورنڈم میں کہا گیا ہے کہ ملائم سنگھ یادو کی قیادت والی سماج وادی پارٹی کی سابقہ حکومت میں اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے کاموں سے متعلق ایک کتابچہ 'محکمۂ اطلاعات و نشریات اتر پردیش' کے ذریعے ستمبر ۱۹۹۳ میں شائع کرایا گیا تھا، جس میں درج متعدد نکات پر عمل درآمد اب تک ملتوی ہے۔ میمورنڈم میں کہا گیا ہے کہ افسوس کی بات ہے کہ حکومت کی کوششوں کے باوجود آج تک اردو کی درسی کتابوں کی طباعت نہیں ہوئی، جب کہ دیگر تمام مضامین کی کتابیں نہ صرف طبع ہوئیں بلکہ انھیں وزیر تعلیم کے ہاتھوں طلبہ کو تقسیم بھی کیا گیا۔ میمورنڈم میں رکن اسمبلی کو اردو میں حلف لینے کے لیے موثر انتظام کرنے، پی سی ایس (جے) میں دوبارہ اردو کا پرچہ شامل کرنے وغیرہ کے سلسلے میں بھی اب تک عمل درآمد نہیں ہوا، جس کی وجہ سے محبان اردو میں ناراضگی ہے۔ اسی طرح کتابچہ میں پرائمری، جونیئر و ثانوی سطح پر سرکاری اسکولوں میں اردو مادری زبان کے طلبہ کے لیے معقول انتظام کرنے، اردو اساتذہ کی تقرری کرنے، اردو کی درسی کتب کی طباعت و فراہمی، تمام سرکاری محکموں کے شعبوں میں (ہر دفتر میں) ایک اردو مترجم کی تقرری، تعیناتی، ہر سرکاری تقرری جس میں تحریری امتحان ضروری ہے، وہ ہندی کے علاوہ اردو میں بھی کرانے کے اعلانات و امکانات شامل ہیں، جن پر عمل درآمد کی سخت ضرورت ہے۔ عبدالنصیر ناصر نے سابق وزیر اعلا اور سپا سربراہ ملائم سنگھ یادو نیز وزیر اعلا اکھلیش یادو سے مطالبہ کیا کہ مذکورہ اعلانات پر عمل درآمد کرائیں تاکہ ۲۰۱۴ کے انتخابات میں محبان اردو کی تائید ۲۰۱۲ کی طرح حاصل کی جاسکے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

2+ اسکولوں میں اردو اسامیاں نہ ہونے پر اظہار تشویش

بارا چکیا، بہار (۲۶ جون)۔ انجمن ترقی اردو ترہت ڈویژن کی ایک نشست حاجی مارکیٹ میں منعقد ہوئی جس میں انجمن ترقی اردو کے عہدیداران اور کارکنان نے شرکت کی۔ نشست کی صدارت انجمن کے صدر ڈاکٹر محمد حاتم جاوید نے کی جب کہ نظامت کے فرائض عبدالستار رحمانی (صدر شعبہ اردو ڈی پی ایس انٹر کالج چکیا) نے کی۔ نشست میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد وسیم رضا نے کہا کہ اخبارات کے ذریعے اردو آبادی کو اطلاع ملی ہے کہ چکیا نگر پنچایت کے 2+ اسکولوں میں اردو کا ایک بھی عہدہ نہیں ہے جب کہ نگر پنچایت کے دو 2+ اسکولوں میں اردو طلبہ و طالبات کی کل تعداد 667 ہے جس میں بوائز ہائی اسکول چکیا میں طلبہ کی تعداد 362 اور گرلس ہائی اسکول چکیا میں طالبات کی تعداد 305 ہے۔

انھوں نے کہا کہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت دونوں اسکولوں کے دونوں عہدوں کو ختم کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اردو آبادی میں رنج و غم ہے۔ اس جلسے میں انھوں نے فوراً کارروائی کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو ترہت ڈویژن کے سکریٹری شکیل شائق نے کہا کہ چکیا نگر پنچایت کے دونوں 2+ اسکولوں سے اردو کا عہدہ ختم کرنا اردو کو ختم کرنے کے مترادف ہے اور انجمن تمام ضروری کاغذات بذریعہ میل انجمن ترقی اردو بہار کے سکریٹری عبدالقیوم انصاری اور پروفیسر صفدر امام قادری کو ارسال کر رہی ہے تاکہ اس سمت میں فوری کارروائی کرتے ہوئے دونوں اسکولوں میں اردو کے عہدوں پر طلبہ کی تعداد کے تناسب سے اردو اساتذہ کی بحالی کی جاسکے۔ انجمن کے صدر ڈاکٹر محمد حاتم جاوید نے کہا کہ اردو ہندوستان کی ایک شیریں اور پیاری زبان ہے اس لیے اس کی حفاظت ہماری اہم ذمہ داری ہے اور اس کی حفاظت اسی وقت ہوگی جب بچے اردو پڑھیں گے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ 667 طلبہ و طالبات کے داخلے کے باوجود اردو اساتذہ کی بحالی کی کوئی سیٹ نہیں ہے۔ اس لیے انجمن وزیر اعلا نتیش کمار، وزیر تعلیم پی کے شاہی اور کونسل کے ڈپٹی چیئرمین سلیم پرویز سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس ضمن میں خصوصی احکام جاری کیے جائیں اور صرف چکیا پنچایت میں نہیں بلکہ پورے بہار میں جہاں بھی اس طرح کی سازش کی گئی ہو وہاں کے طلبہ کے تناسب سے اساتذہ کی بحالی کی جائے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

روزمرہ کی زندگی میں اردو کا استعمال کریں

نئی دہلی (۱۳ جولائی)۔ کل ہند تحریک اتحاد بین المسلمین نے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اردو کے فروغ میں دل چسپی کا مظاہرہ کریں اور روزمرہ کی زندگی میں اردو کا استعمال کریں۔ یہاں جاری ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ نئی نسل کو اردو پڑھائیں تاکہ آگے چل کر اردو پڑھنے لکھنے والوں کی کمی نہ ہو۔ خاص طور پر بینکوں میں لین دین کرتے ہوئے اپنا چیک اور فارم اردو میں بھریں کیوں کہ ریزرو بینک آف انڈیا نے اپنے خط نمبر D.OB D: No. Le G-58 9/09.07 007/2003 اور وزارت خزانہ نے اپنے خط نمبر 11016/1/2005 میں تمام بینکوں کو ہدایات دی ہیں کہ وہ اردو میں بھرے چیک قبول کریں اور اس کام کے لیے اپنے بینک اسٹاف میں مترجمین کا انتظام کریں۔ اگر تمام لوگ بینک فارم، چیک، فارم، ریزرویشن فارم میں اردو استعمال کرنے لگیں گے تو سرکار کو ہر محکمے میں اردو مترجمین اسٹاف کی تقرری کرنی پڑے گی۔ تحریک نے دفتر، دکان اور مکان پر نام کی تختی یا بورڈ اردو میں لکھنے اور شادی اور دیگر تقریبات کے دعوت نامے اردو میں چھپوانے کی بھی اپیل کی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

ونپرتی میں اردو ڈگری کالج کے قیام کی یقین دہانی

ونپرتی (۱۳ جون)۔ ونپرتی میں اردو میڈیم ڈگری کالج کے قیام کے لیے اقدام کرنے کی سابق وزیر اور PCC نائب صدر ڈاکٹر جی چنا ریڈی نے تیقن دیا۔ کل منتقر ونپرتی میں جدید تعمیر کردہ اردو میڈیم ہائی اسکول کی تکمیل پر اس کی کنجیاں ہیڈ ماسٹر اردو میڈیم ہائی اسکول کے حوالے کیا گیا۔ اس سے قبل سابق وزیر نے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ اردو میڈیم ہائی اسکول کی تعمیر میں تاخیر ہوئی ہے جس کی وجہ سے طلبہ کرایے کے مکان میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اب جدید تعمیر کردہ عمارت میں طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم ہوا ہے۔ انھوں نے طلبہ سے کہا کہ تعلیم ہی ایک بہترین ہتھیار ہے۔ طلبہ محنت اور جستجو کے ساتھ تعلیم حاصل کرکے ونپرتی کا نام روشن کریں۔ اس سے قبل الحاج محمد یٰسین (پرنسپل ہندی پنڈت کالج) نے اردو میڈیم ہائی اسکول کے طلبہ کے ایس ایس سی میں اعلا نمبرات سے کامیاب ہونے پر فی کس 1000 روپے انعام دینے کا اعلان کیا اور اسکول میں کرسیوں کی فراہمی کا بھی اعلان کیا۔

(سیاست، حیدرآباد)

راجدھانی کے سٹی زون کے دفتر میں اردو زبان کے ساتھ مذاق

نئی دہلی۔ ملک کی راجدھانی دہلی میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر منعقد سیمینار، سمپوزیم اور ورکشاپ سمیت دیگر تقریبات میں اردو کے فروغ کے تعلق سے وقتاً فوقتاً اعلانات کیے جاتے ہیں۔ سرکار کے زیر انتظام چل رہے اردو اداروں کے ذریعے بھی اردو کی تعمیر و ترقی پر زور دیا جاتا ہے تاکہ اس زبان کو موجودہ وقت میں اس کا مقام دلایا جاسکے، لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ سرکاری سطح پر اس زبان کے ساتھ ہی کھلواڑ کیا جارہا ہے بلکہ سرکاری اداروں میں نام غلط تحریر کرنے کی جو روایت برسوں پہلے شروع ہوئی تھی وہ آج بھی بدستور جاری ہے۔ فی الحال دہلی سرکار اور دہلی میونسپل کارپوریشن کے ذریعے اپنے ہی اداروں کے سائن بورڈ پر اردو زبان میں نام غلط لکھے جانے کو اردو کے فروغ کی بات کرنے والے ہی سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں، اس کا ثبوت ایم سی ڈی کے سٹی زون کا آصف علی روڈ پر واقع دفتر پیش کر رہا ہے جہاں ہندی، انگریزی اور پنجابی زبان میں صحیح نام لکھے گئے ہیں، جب کہ اردو زبان میں غلط طریقے سے 'شمالی دہلی میونسپل کارپوریشن' کے مقام پر 'اتری دہلی میونسپل' تحریر کیا گیا ہے۔

دہلی میونسپل کارپوریشن کے ذریعے قدیم دہلی کی روایتی زبان اردو جو بہت ہی پرکشش، خوش خط انداز میں تحریر کی جاتی تھی، اس کے ثبوت میں نقاشی کیے ہوئے پرانے کتبے کی شکل میں پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کو مثال کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اب اردو سے سرکاری ذمہ داروں اور کارپوریشن کے عہدیداروں کی بے رخی، بیزاری، تعصب اور غیر ذمہ داری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو جن کی مادری زبان اردو تھی، ان کے ناموں کو بھی انتہائی غلط انداز میں لکھ دیا جاتا ہے۔ راجدھانی میں 'مہاتما گاندھی' کو 'مہاتمہ' کی شکل میں اور قومی شاہراہ پر واقع 'اندرپرستھ' پارک کو 'پرست' اور سرائے کالے خاں بس اڈہ واقع نظام الدین روڈ کو 'نظام الدین' کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح راجدھانی کے مختلف پارکوں پر آمد و رفت کے اشاروں کو غلط لکھ کر اردو کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔

سرکاری سطح پر اداروں کے سائن بورڈ اور سڑکوں کے اشاروں کے بورڈ پر بے تحاشا رقم خرچ کی جارہی ہے، لیکن پانی کی طرح پیسہ بہاکر بھی ملک کی راجدھانی میں اردو زبان کے ساتھ کس طرح کا سلوک ہو رہا ہے یہ بات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آصف علی روڈ پر واقع سٹی زون کے دفتر سے متصل ملک کے پہلے خاتون ہاٹ کے دفتر پر انگریزی اور ہندی زبان کو عزت بخشی گئی ہے لیکن اردو زبان غائب ہے۔

قابل ذکر ہے کہ سٹی زون دفتر کے عین سامنے واقع جی بی پنت اسپتال میں وال سٹی سمیت دیگر مسلم علاقوں کے ہزاروں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے لیکن جب وہ یہاں زون دفتر پر نگاہ ڈالتے ہیں تب انھیں مسلم نمائندوں کو منتخب کرنے پر حیرت ہوتی ہے جو اپنی زبان کا خود مذاق اڑا رہے ہیں۔ شمالی دہلی میونسپل کارپوریشن کے سٹی زون دفتر پر 'اتری دہلی میونسپل کارپوریشن' تحریر کیا گیا ہے۔ زون دفتر میں صرف چیئرمین آل محمد اقبال اور ڈپٹی چیئرمین عمران حسین کے کمروں پر نام کی تختی پر ہندی، انگریزی کے ساتھ اردو زبان کو کافی خوش خط تحریر کیا گیا، اس کے برعکس پورے زون دفتر میں کسی بھی افسر، ملازم یا پھر اعلانیہ نوٹس بورڈ پر اردو زبان نظر نہیں آتی ہے جب کہ ہندی اور انگریزی زبان کو عزت بخشی گئی ہے۔

واضح رہے کہ سٹی زون میں چار مسلم کونسلر ہیں جن میں سے زیادہ تر ہر ہفتے جمعے کو ہونے والی میٹنگ میں آصف علی روڈ پر واقع زون کے دفتر میں حصہ لیتے ہیں۔ مسلم کونسلروں میں جامع مسجد سے خرم اقبال، ترکمان گیٹ سے آل محمد اقبال، بازار سیتا رام سے سیما طاہرہ اور بلیماران سے عمران حسین شامل ہیں۔ واضح رہے کہ آل محمد اقبال، خرم اقبال اور سیما طاہرہ کے گھر اور دفاتر زون دفتر کے ایک کلو میٹر، جب کہ عمران حسین کا گھر دو دفتر شاید دو کلومیٹر کے دائرے میں آتا ہے لیکن ان چاروں مسلم کونسلروں کو سٹی زون کے دفتر پر اردو زبان کا مذاق بنتے نظر نہیں آتا ہے۔ اس تعلق سے سٹی زون کے چیئرمین آل محمد اقبال نے کہا کہ غلط ناموں کو فوری درست کرایا جائے گا اور زون کے تمام دفاتر پر جہاں اردو میں نام کی تختیاں نہیں ہیں اس کے لیے وارڈ کمیٹی کی میٹنگ میں تجویز لائی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ہندی اور انگریزی کے ساتھ اردو زبان میں عوامی جانکاریاں بھی نوٹس بورڈ پر چسپاں ہوں گی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : سید احتشام حسین
ذکر و فکر
مصنف : ڈاکٹر علی احمد فاطمی
اشاعت : ۲۰۱۳ء
ضخامت : ۱۲۸ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : ادارۂ نیا سفر
68- مرزا غالب روڈ
الٰہ آباد (یوپی)
تبصرہ نگار : خالد اشرف

پچھلے دو سال اردو اکابرین: فیض احمد فیض، مجاز لکھنوی، سید احتشام حسین، معین احسن جذبی، سعادت حسن منٹو اور علی سردار جعفری وغیرہ کی ولادت کے سو برس کا عرصہ رہے اور اس حوالے سے سیناروں، خصوصی شماروں، مباحثوں اور اشاعتوں کی بڑی گرم بازاری رہی اور یہ بات طے ہے کہ جو شہرت عمومی طور پر شاعروں کو اور ان کی بدنامی کے باعث منٹو کو نصیب ہوئی وہ احتشام حسین جیسے سنجیدہ ناقد کو نہ ہو سکی۔ ایک تو تنقید جیسا خشک مضمون، دوم وارث علوی والا چٹخارہ نہیں، سوم احتشام حسین کی لکھنوی شائستگی لیکن ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ان کے علمی کارناموں پر توجہ دی، ان پر ایک اہم مونوگراف لکھا اور زیر تبصرہ کتاب تصنیف کی، کیوں کہ وہ خود احتشام حسین، سید عقیل رضوی اور ڈاکٹر قمر رئیس کی روشن خیال ادبی قدر شناسی کو فروغ دینے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ فاطمی صاحب کو احتشام حسین کا شاگرد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ انھوں نے استاد سے ذاتی مراسم کا احوال، 'تہذیب سے تعلیم تک' کتاب کے آخر میں بیان کیا ہے اور ابتدائی دس ابواب میں ان کی تنقید، غالب شناسی، ترقی پسند تحریک سے وابستگی، دوسرے استاد سید عقیل رضوی کی احتشام شناسی، ان کے سفرنامے اور ان کی افسانہ نگاری سے بحث کی ہے۔

فاطمی صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ احتشام صاحب سے قبل اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری ترقی پسند تنقید کے بنیاد گزاروں کے طور پر ادب اور انقلاب، ادب اور زندگی، ادب اور عوام، ادب اور تہذیب، جنگ اور ادب جیسے انقلابی نوعیت کے مقالے تصنیف کر چکے تھے اور ان تصانیف کو بنیاد بنا کر احتشام صاحب نے ادب اور اخلاق، مواد اور ہیئت، ترقی پسندی کی روایت، نیا ادب اور ترقی پسند ادب جیسے اساسی موضوعات پر مضامین لکھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاطمی صاحب نے اس کتاب میں احتشام حسین کے فکری رویوں اور ذہنی ترجیحات کے منابع تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور مارکسی جدلیات کے پہلو بہ پہلو ان کی تنقید میں تہذیب و ثقافت کے تفاعل کی بھی نشاندہی کی ہے۔ فاطمی صاحب نے بجا طور پر احتشام، آل احمد سرور اور ممتاز حسین وغیرہ کی ناقدانہ کوششوں کو ترقی پسند تنقید کے سنہری دور سے تعبیر کیا ہے اور پروفیسر محمد حسن، سید عقیل رضوی اور ڈاکٹر قمر رئیس کے لیے مشعل راہ قرار دیا ہے۔ بلاشبہ 'سید احتشام حسین: ذکر و فکر' احتشام صاحب کی فکر کو سمجھنے میں ایک بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

OOO

نام کتاب : عطاء اللہ پالوی
(تہذیب فکر و آگہی)
مصنف : شبر امام
ضخامت : ۵۷۹ صفحات
قیمت : ۳۰۰ روپے
ملنے کا پتا : حسینی سماج، پالی کالونی، پٹنہ
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی

اردو ادب میں عصر حاضر میں چند ہی تخلیق کار ایسے ہیں جن کو جنون کی حد تک تصنیف و تالیف کا شوق ہے اور وہ یکے بعد دیگرے مشن کے طور پر اپنی نئی نئی تخلیقات منظر عام پر لانے میں سرگرم رہتے ہیں۔ شبر امام بھی اردو ادب کے ایک مجاہد کا نام ہے جو ضعیف العمری کے باوجود بھی سال میں کم از کم دو ضخیم کتابوں کو منظر عام پر لا کر ہی دم لیتے ہیں، کبھی کبھی یہ تعداد بڑھ بھی جاتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'عطاء اللہ پالوی: تہذیب فکر و آگہی' (حصہ چہارم) اس بات کا بین ثبوت ہے۔ شبر امام نے عطاء اللہ پالوی کو اردو ادب کے حوالے سے بہار کے منظرنامے پر متعارف کرانے کا کام کیا بلکہ اس سلسلے کو انھوں نے اتنا طویل کر دیا کہ بہار کے حوالے سے اردو ادب کی تحقیق کرنے والے محقق اور ناقد انگشت بدنداں ہیں، بہرحال تمام دشواریوں کے باوجود جو کارنامے عطاء اللہ پالوی کے حوالے سے شبر امام نے انجام دیے وہ حیرت زدہ کرنے والے ہیں۔

کتاب چار ذیلی ابواب میں تقسیم کی گئی ہے، پہلے باب میں عطاء اللہ پالوی احوال و آثار، ان کی ابتدائی تحریر، پالوی کا دوسرا تنقیدی ادبی تحفہ، فن اور انداز تنقید کے علاوہ علی گڑھ پالی اور ماحول سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ آخر میں 'غالب اور مومن میری نظر میں' کے عنوان سے عطاء اللہ پالوی کا ایک مضمون بھی شامل کیا ہے۔ دوسرے باب میں ناقد بنام ناقد کے تحت عطاء اللہ پالوی کے کئی تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں عندلیب شادانی، جگر مرادآبادی، میر انیس اور فردوسی پر مرزا صاحب کی رائے، بال جبریل پر دو نظر، جلیل لکھنوی اور داغ کے علاوہ عطاء اللہ پالوی کی ادبی چوکیداری بھی شامل ہے۔ تیسرے باب میں 'اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر' کے عنوان سے عطاء اللہ پالوی کی آخری تحریر اور رائے کو پیش کیا گیا ہے۔ آمنہ ابوالحسن کا افسانہ آشیرواد بھی شامل ہے۔ کلام اقبال کی تدوین، رشید حسن خاں، پالوی کے تنقیدی اور اصلاحی ادبی معرکے بھی شامل ہے جو 'شاعر' ۱۹۳۵ میں شائع ہوا تھا۔ 'بہار اور بہاریت' کے عنوان سے پالوی کے سرسری حوالے سے پروفیسر شاہت حسین کے خط کو شبر امام نے شامل کر کے بہاریت کے حوالے سے کچھ اور تفصیل پیش کر دی ہے۔ وفا براہی کے شعری مجموعے نکہت گل اور سحر نظری پر عطاء اللہ پالوی کا فاضلانہ تبصرہ بھی شامل کتاب ہے۔ 'پالوی: ایک مثالی ہندوستانی' کے تحت پالوی کی نادر کتاب 'اردو کے ہندو مثنوی نگار' سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں پالوی کا مطلوب و مقصود کے تحت مولانا آزاد کی بغاوت آزاد اور پالوی: ایک جائزہ، پالوی کی نثر نگاری کا نمونہ، آزاد کی خوشحالی، پالوی کی بدحالی وغیرہ کے ذیلی عنوان سے تفصیلی مضمون شامل ہے۔ آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ پالوی صاحب سے متعلق یہ چوتھی جلد بھی سیر حاصل تفصیل اور تجزیے سے بھرپور ہے۔ امید کہ اس تخلیقی کوشش کی خاطر خواہ پذیرائی کی جانی چاہیے اور مصنف شبر امام کے تحریری حوصلوں کو بھی سلام کرنا چاہیے اس امید کے ساتھ کہ ابھی فکری بصیرت اور تحقیق و جستجو اور تلاش کا سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔

OOO

بقیہ: دبستانِ آرکاٹ...

صفحہ ۲ سے آگے

ذوالفقار خاں نصرت جنگ کی تعریف میں لکھے گئے قصائد کے مکمل متن کو شائع کر دیا[۱۸] اس مضمون میں ڈاکٹر اثر نے باقی کے دیوان ریختی 'مثنوی یوسف و زلیخا' کے علاوہ اس کے دیگر منظومات کا بھی تعارف کروایا ہے۔[۱۹]

نواب ذوالفقار خاں کی شجاعت، بہادری اور عدل و سخاوت کی تعریف کی گئی ہے اور یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ اس زمانے میں نواب ذوالفقار خاں کی دلیری سے خوف زدہ ہو کر انگریز، ولندیزی اور دوسری قومیں جو اس وقت ہندستان میں تجارت کی غرض سے آئی ہوئی تھیں، نواب موصوف کو تحفے تحائف بھی بھیجا کرتی تھیں۔

غرض نواب ذوالفقار خاں کے عہد میں ایک طرف فارسی اور اردو کے شاعروں نے آرکاٹ کو اپنا مسکن بنایا تو دوسری طرف عالموں اور صوفیوں نے بھی نواب موصوف کی داد و دہش کا شہرہ سن کر آرکاٹ کا رخ کیا تھا۔ پروفیسر محبوب پاشا لکھتے ہیں:

"ہر علم اور ہر پیشہ کے افراد نے ان کی داد و دہش کا شہرہ سن کر آرکاٹ کا رخ کیا۔ خصوصاً صوفیا و مشائخین کا قافلہ کا قافلہ بیجاپور سے آرکاٹ آنے لگا۔ قادریہ طریق کے جتنے بھی مشائخین بیجاپور میں تھے، ان میں سے اکثر بزرگوں نے آرکاٹ اور اس کے اطراف و اکناف کو اپنا مسکن بنایا۔"[۲۰]

نواب ذوالفقار کی وفات کے بعد نواب داؤد خاں پنی آرکاٹ کے صوبیدار بنے۔ ان کے والد خضر خاں افغان نسب سے تعلق رکھتے تھے۔ مولف 'مآثر الامرا' کا بیان ہے کہ داؤد خاں پنی 1701 میں ذوالفقار خاں نصرت جنگ اور 1703 میں آرکاٹ (کرناٹک) کے نواب (صوبیدار) بنائے گئے۔[۲۱] مغل فرماں روا بہادر شاہ کے 1710 میں داؤد خاں پنی کو دہلی طلب کرنے کے بعد 1714 میں ایک لڑائی میں وہ بندوق کی گولی کا نشانہ بنے اور داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔[۲۲]

نواب داؤد خاں پنی کے دہلی جانے کے بعد نواب سعادت اللہ خاں نائطی (34-1710) کرناٹک (آرکاٹ) کے صوبیدار بنائے گئے۔ نواب سعادت اللہ خاں اہل نائط سے تھے، انھی سے آرکاٹ پر خاندانِ نوائتا کی حکمرانی کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کا اصل نام سعید کوکنی تھا اور وہ عاقبت محمود خاں کے فرزند تھے۔[۲۳] 'تاریخ النوائتا' کے مولف کا بیان ہے کہ:

"نواب سعادت اللہ خاں اپنے حقیقی بھائی غلام علی کے ساتھ شہنشاہ عالمگیر کے لشکر میں وارد ہوئے۔ نواب داؤد خاں پنی کے حسن توسط سے ابتداءً آپ کا تعلق منصب داران شاہی کے زمرے سے ہوا پھر آپ کی مجسم قابلیت اور شہنشاہ عالمگیر کی مردم شناسی اور حفظ منزلت نے آپ کو خطاب سعادت اللہ خاں سے امتیاز بخشا۔"[۲۴]

نواب سعادت اللہ خاں کے دور کے کارناموں میں قلعہ جنجی کی فتح غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کو 1697 میں نواب ذوالفقار خاں نے فتح کر کے مرہٹوں سے حاصل کیا تھا لیکن یہ قلعہ بہت جلد مسلمانوں کے قبضے سے نکل گیا۔ نواب سعادت اللہ خاں نے 1713 میں اس قلعے کو دوبارہ تسخیر کر کے اس کا نام نصرت گڑھ رکھا۔ نواب سعادت اللہ خاں کی میسور اور ترچناپلی کے راجاؤں سے بھی معرکہ آرائی ہوئی اور ہر مقابلے میں انھوں نے کامیابی حاصل کی۔ نواب سعادت اللہ خاں نے 1734ء/1147ھ میں وفات پائی۔

"یافت جنت ز بندگی علی" سے ان کی تاریخ وفات (1147ھ) نکلتی ہے۔

نواب سعادت اللہ خاں ایک طرف میدان کارزار کے سورما تھے تو دوسری طرف علوم مذہبی اور شعر و ادب کے قدردان بھی تھے۔ وہ بہت ہی نیک صفت، نیک طبیعت اور خدا ترس انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کے عہد میں اہل علم و فضل کی ایک کثیر تعداد آرکاٹ میں موجود تھی۔ میر روشن علی قادری مولف 'تعرفات برہانی' کا بیان

ہے کہ:

''اس زمانے میں آرکاٹ میں تین سو ساٹھ مکانات مشائخین کے تھے۔ آرکاٹ میں حضرت سید علی محمد الحسینی القادری صبغۃ اللٰہی کا مرتبہ ممتاز تھا اور اس وقت کے کل مشائخین کے مکانات میں آپ کا مکان 'سرمکان' کہلاتا تھا۔ چناں چہ اب تک تاج پورہ کا مکان 'سرمکان' کہلاتا ہے۔ آرکاٹ، مدراس، رانی پیٹ اور ویلور وغیرہ میں اس مکان کی بہت بزرگی ہے''۔[۱۸]

نواب سعادت اللہ خاں کے عہد کے صاحب تصنیف بزرگوں اور شاعروں میں حضرت سید عبدالقادر میراں شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ محمد اور جسونت رائے منشی کے نام قابل ذکر ہیں۔

حضرت میراں شاہ ولی اللہ اپنے وقت کے ایک جید عالم اور صوفی تھے۔ نواب سعادت اللہ خاں نے آپ کو قطعہ تمکنگل بطور جاگیر عطا کیا تھا۔[۱۹] حضرت میراں شاہ ولی اللہ کے ایک نثری رسالے کا تعارف پروفیسر محمد ہاشم علی نے اپنے ایک مضمون 'خلاصۃ الرویت اور اس کا مصنف' مشمولہ مجلّہ تحقیقات اردو' جامعہ عثمانیہ میں کروایا ہے۔[۲۰] 'خلاصۃ الرویت' کے چار مخطوطوں کا پتا چلتا ہے۔[۲۱] ایک قلمی نسخہ مینو اسکرپٹ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے۔ ایک کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں، ایک مینو اسکرپٹ لائبریری میسور میں اور ایک باقر حسین صاحب کے شخصی کتب خانے کی زینت ہے۔ ڈاکٹر ہاشم علی لکھتے ہیں:

''شاہ میراں حسینی ولی اللہ کا نام سید عبدالقادر تھا، لیکن وہ میراں شاہ ولی اللہ منزوی الجبلین کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام سید شاہ وزیراللہ تھا اور جو مشہور صوفی سید شاہ ہاشم حسینی خداوند ہادی کے فرزند اکبر تھے۔ میراں شاہ ولی اللہ کے دو فرزند بھی صاحب تصنیف رہے ہیں۔ ان میں ایک شاہ محمد حق نما ہیں جو 'خزانۃ عبادت' اور 'خزانۃ معرفت' کے مصنف ہیں اور دوسرے شاہ صدرالدین ہیں جو ٹیپو سلطان شہید کے مرشد تھے''۔

شاہ صدرالدین کے نثر میں سات رسالوں اور نظم میں سترہ مثنویوں کا پتا چلتا ہے۔[۲۲]

(باقی آئندہ)

بقیہ: نصرت محی الدین: چند یادیں

صفحہ ۸ سے آگے

ہر دو موقعوں پر نصرت محی الدین اور دیگر نوجوانوں کی قیادت میں پربھات پھیریاں منعقد کی جاتی تھیں بعد ازاں اہلیان محلہ کی بھاری تعداد کی موجودگی میں قومی پرچم لہرایا جاتا، آزادی، جمہوریت اور قومی یک جہتی کے زیر عنوان مہمانان تقاریر کرتے، دن بھر کھیل کود کے مقابلے ہوتے، رات میں ہال والا پیلس میں کلچرل پروگرام ہوتا اور انعامات تقسیم ہوتے۔ نواب احمد علی خاں کی ڈیوڑھی میں مشاعرے، ادبی سیمنار اور سمپوزیم کا انعقاد عمل میں آتا۔ اب بھی یوں تو ۲۶ جنوری اور ۱۵ اگست کے تاریخی دن آتے ہیں اور خاموشی سے گزر جاتے ہیں کچھ سیاسی پارٹیاں اور ان کے کارکن رسم نبھانے کے لیے ترنگا پرچم لہراتے ہیں مگر ان میں وہ جوش اور خوشی جو پہلے ہوا کرتی تھی نہیں ہے۔ دراصل ہماری نام نہاد سیکولر سیاسی پارٹیوں اور حکومتوں نے اپنے طرز عمل سے ملک کے ایک بڑے طبقے کو آزادی کے ثمرات سے محروم کرکے ان میں نفرت پیدا کر دی ہے۔

ادبی ٹرسٹ کے سالانہ مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے جب شعرا اور ادبا حیدرآباد آتے تو ان کے لیے ڈیوڑھی نواب احمد علی خاں (سابق وزیر داخلہ) میں شایان شان استقبالیہ ترتیب دیا جاتا تھا اور نواب صاحب بہ نفس نفیس اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود شریک ہوا کرتے تھے۔ مختلف اوقات میں ترتیب دیے گئے استقبالیے میں ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، مجروح سلطان پوری، دلاور فگار، اختر الایمان، غرض ملک بھر کے نامور اور چوٹی کے شعرائے کرام نصرت محی الدین کی بے پناہ دلچسپی اور کوششوں سے اس تاریخی سرزمین پر قدم رنجاں ہو چکے ہیں۔

جہاندار افسر، بشیر انور، مجتبیٰ حسین، حسن علی اور حسن بن علی وغیرہ ہمارے سینئرس رہے ہیں، انھوں نے مغل پورہ میں یوتھ فیسٹول کی داغ بیل ڈالی لیکن جب ہم نصرت محی الدین کی قیادت میں سرگرم عمل ہو گئے تو فیسٹول کے انعقاد کی ذمہ داریاں بھی ہم نے سنبھال لیں لیکن یہ تجربہ کار سینئرس قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرکے یوتھ فیسٹول کو ہر طرح کامیاب بنانے میں تعاون کرتے رہے، اس طرح مغل پورہ میں ہر سال یا دو سالی بعد یوتھ فیسٹول کے نام پر نوجوانوں کے جشن کا انعقاد ہونے لگا۔

ہندستان میں آزادی کے بعد ہی سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ فسطائی طاقتوں اور ان کے آلۂ کار محض اقتدار کے حصول کی خاطر ہندو مسلم منافرت میں روز بروز اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ ان کے معاندانہ طرز عمل اور ریشہ دوانیوں نے ملک کے مسلمانوں کو قومی دھارے سے علاحدہ الگ تھلگ کر رکھا ہے۔

۱۹۶۵ کی جنگ کے اثرات اندرون ملک ہندوؤں اور مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں پر منفی انداز میں مرتب ہونے لگے تھے۔ نوجوانوں میں بڑھتی دوریاں، نفرتوں اور عداوتوں کو پاٹنے کے لیے نصرت محی الدین نے ناقابل فراموش قدم اٹھایا۔ دراصل اس تاریخی اقدام نے ہی نصرت کو شہر حیدرآباد بالخصوص پرانے شہر میں 'نصرت' بنا کر پیش کیا تھا۔ اس پُرآشوب موقعے پر نصرت نے اپنے ہم خیال، ترقی پسند اور سیکولر ذہن و فکر کے حامل ہندو مسلم دوستوں کے تعاون اور اشتراک عمل سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان آپسی اتحاد اور بھائی چارے کو پروان چڑھانے کے لیے نوجوانوں کے جشن کا اہتمام کیا اور محلہ مغل پورہ کو ہندو مسلم اتحاد کی علامت کے طور پر 'ناشقند' کا نام دے کر ایک ہفتہ طویل کھیل کود کے مقابلے منعقد کیے تھے اور ہندو مسلم بستیوں میں گھوم کر جشن کے اغراض و مقاصد سے ہندو مسلم نوجوانوں کو واقف کرایا اور جشن میں حصہ لینے کی کامیاب ترغیب دی۔ یہ جشن اتنا کامیاب ہوا تھا کہ ہندو مسلم نوجوان آپسی بھید بھاؤ بھول کر دوش بدوش مقابلوں میں حصہ لینے 'ناشقند' گراؤنڈ آنے لگے۔ اس بامقصد جشن کی کامیابی اور مقبولیت کے چرچے اتنے عام ہو گئے تھے کہ جشن کا بچشم خود مشاہدہ کرنے جہاں مقامی، سیاسی، علمی اور سماجی قائدین اور کارکنان آنے لگے تھے وہیں اس وقت کے گورنر گجرات جناب مہدی نواز جنگ بہادر بھی از خود مغل پورہ پلے گراؤنڈ پہنچ گئے تھے اور جشن کے محرک اور روح رواں نصرت محی الدین کو اس مثالی جشن کے کامیاب انعقاد پر مبارک باد پیش کی تھی۔ ●●

نصرت محی الدین: چند یادیں

مسعود فضلی (23-2-302، مغل پورہ، حیدرآباد، آندھراپردیش)

مجھے تو آج بھی یقین نہیں آتا کہ نصرت محی الدین اب ہم میں نہیں ہے۔ دور بہت دور چلا گیا جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا صرف جانے والے کی یادیں آتی ہیں۔ وہ جب بھی مجھ سے بچھڑتے تو دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوا کرتے تھے لیکن اب کی بار پھر ملنے کا وعدہ کیے بغیر ہی ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ جب یہ احساس ہوتا ہے کہ نصرت اس دار فانی سے کوچ کر گیا ہے تو میری آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں اور دل میں ایک ہوک سی اٹھنے لگتی ہے تو احساس جاگنے لگتا ہے کہ شاید اب 'ہم بھی جانے والے ہیں'۔

''انسان جب اس فانی دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے تو دراصل اس کے لیے وہی قیامت کا آجانا ہے''۔

آہ! نصرت تم کہاں ہو؟ کیا یوں اچانک چھوڑ جانے کے لیے دوستی کی تھی۔ ہماری دوستی عام دوستی کی طرح نہ تھی بالکل بے لوث اور اٹوٹ۔ اس کی جڑیں بڑی مضبوط اور گہرائی میں پیوست تھیں۔ گزشتہ پچاس برسوں میں کتنے طوفان آئے مگر ہماری رفاقت کے تناور درخت کو کوئی گزند پہنچائے بغیر گزر گئے مگر اجل کے ایک جھونکے نے اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ آج کے پرآشوب زمانے میں جب کہ ہر طرف نفسا نفسی، خود غرضی، مفاد پرستی، اخلاقی اور سماجی افراتفری پھیلی ہوئی ہے ایسے میں کسے کہاں اتنی فرصت کہ لاحاصل سرگرمیوں میں اپنا سر کھپائے اور وقت برباد کرے۔ اس افراتفری اور عالم بدحواسی میں عوامی، سماجی، ادبی اور تہذیبی خدمات کا جذبہ لے کر اٹھے اور بدلے میں کسی صلے یا ستائش کی توقع نہ رکھے۔ یقیناً ایک قابل قدر بات ہے۔ ایسے ہی کچھ آشفتہ سر لوگوں کے سروں میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا سودا سمایا ہوا ہوتا ہے جو انھیں کسی حال میں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا، کچھ نہ کچھ کرتے رہنا اور دوسروں کو ترغیب دینا اور ان میں تحریک پیدا کرنا ہی ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ ایسے ہی قلندر صفت مجاہدوں میں نصرت محی الدین مرحوم کا شمار ہوتا ہے۔

نصرت محی الدین کی عوامی، سماجی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا بے داغ سلسلہ کم و بیش زائد از نصف صدی پر محیط رہا ہے۔ ان کی شب و روز کی زندگی اور مصروفیتوں کا بہ نظر غائر جائزہ لیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ تادم آخر وہ دشت عمل کے ریگزاروں میں صحرا نوردی میں مصروف رہے۔

آج اگر کچھ مخلص احباب اظہار تعزیت کے طور پر ان کی دیرینہ عوامی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں تو وہ ان کے تئیں احسان مندی کا اظہار ہی تصور کیا جائے گا۔ آج ہم ان کی بے لوث خدمات کا اعتراف تو کر سکتے ہیں لیکن وہ حق ادا نہیں کر سکتے جس کے بجا طور پر وہ مستحق اور حقدار تھے۔

نصرت محی الدین ترقی پسند شاعر اور کمیونسٹ لیڈر کامریڈ مخدوم محی الدین کے بڑے فرزند تھے۔ ۱۳/اپریل ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے اور ۳/اپریل ۲۰۱۳ کو تقریباً 69 برس کی عمر میں اس جہان فانی کو الوداع کہہ گئے۔ کامریڈ مخدوم محی الدین کے فرزند ہونے کے ناطے عزت، دولت اور شہرت یا پھر کوئی سیاسی، عوامی یا سرکاری منصب و رتبہ حاصل کرنا ان کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ والد گرامی کا نام ہی حصول مقصد میں بند تالوں کو کھولنے کے لیے کافی ہوتا، مگر ان کی خودداری نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ اپنے ذاتی مفاد اور مقصد براری کے لیے والد کے نام یا وسیلے کو استعمال کریں۔ وہ صرف اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنی پہچان بنانے پر یقین رکھتے تھے۔

تادم حیات وہ بے شمار ادبی، سماجی اور تہذیبی انجمنوں اور اداروں کے روح رواں رہے۔ انجمن ترقی اردو آندھراپردیش اور تنظیم انصاف پارٹی حیدرآباد کے شریک معتمد، جب کہ شہری انجمن ترقی اردو تنظیم حیدرآباد کے صدر اور روح رواں تھے۔

نصرت محی الدین ایک ہمہ پہلو، فطرتاً خاموش مزاج، مروت پسند اور وضع دار شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے دوستوں اور بہی خواہوں میں بلا امتیاز و تفریق مذہب و ملت، زبان، علاقہ، رنگ و نسل سب ہی شامل تھے۔ مخالفین کی پرواہ کیے بغیر اپنے کام میں لگے رہتے البتہ ان کی مخالفت، اختلاف رائے اور دلائل کو بڑی سنجیدگی اور خندہ پیشانی سے سنتے اور واجبیت پاتے تو اپنے فیصلے اور نظریے میں تبدیلی لاکر مخالفین کی باتوں کو قبول کرتے اور اس پر عمل کرکے کامیابی سے ہمکنار کرتے، چوں کہ فطری طور پر وہ جمہوریت پسند تھے دوسروں پر کبھی اپنی رائے مسلط نہیں کرتے، ہر کام باہمی اتفاق سے کرنے کے عادی و طرفدار تھے۔

نصرت محی الدین میں یوں تو بے شمار خوبیاں تھیں، وہ وقت اور وعدے کی پابندی کا خیال بدرجہ اتم رکھتے اور کہتے کہ کامیابی کا راز کسی کام کو وقت اور وعدے کے مطابق انجام دینے میں ہی ہے۔ وقت اور وعدے کی پابندی میں اس کام کی اہمیت اور دلچسپی باقی رہتی ہے بلکہ وہ کام وقت پر بڑی خوش اسلوبی سے اپنے انجام تک پہنچ جاتا ہے۔

دوسروں کے کام آنا ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ اپنے کام اور وقت کا خیال کیے بغیر دوسروں کی حاجت روائی کے لیے نکل پڑتے اور اس کو پورا کیے بنا دم نہیں لیتے۔ دوسروں کا اثر و رسوخ استعمال کرنا پڑے تو بھی گریز نہ کرتے، لیکن کبھی اپنے کام اور مقصد کے لیے اتنی دوڑ دھوپ نہیں کرتے۔ آج بھی ان کے اپنے اور اپنے گھر کے بیشتر ضروری کام ادھورے رہ گئے ہیں، انھیں دوسروں کے کاموں سے ہی فرصت نہیں تھی جو پورا کرتے۔

نصرت محی الدین ایک یار باش، کھلے دل، ذہن اور دماغ و فکر کے حامل شخصیت تھے۔ کبھی کسی سے ناراض ہوجاتے تو وہ ناراضگی وقتی ہوا کرتی۔ از خود غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے اور دوستی کی تجدید کرکے شیر و شکر ہوجایا کرتے تھے۔ بہرحال مرحوم بے شمار خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ ''عجب مانس تھا جانے کہاں سے آیا اور کدھر چلا گیا وہ''۔ نصرت کے دوستوں میں ہر مذہب، زبان، علاقہ، رنگ و نسل کے امیر، غریب، پڑھے لکھے اور غیر پڑھے لکھے غرض ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ ہر کوئی بڑی اپنائیت سے ملتا، وہ بھی بڑی عزت، خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے کہ ہر کوئی ان کا گرویدہ ہوجاتا اور یوں محسوس کرنے لگتا کہ ان سے بڑی پرانی شناسائی ہے اور وہ ان کے بااعتماد رفیقوں میں شامل ہے۔ ہر ایک سے خلوص، محبت اور اپنائیت سے ملنا، عہدہ و رتبے کا لحاظ کیے بغیر مساویانہ عمل اختیار کرنا ان کی فطرت کا خاصہ تھا۔ اسی خاص وصف کی وجہ سے کوئی ایک بار ملتا تو ان کی محبت، خلوص، اپنائیت اور حسن سلوک کو فراموش نہ کرتا۔

نصرت محی الدین سے میری ملاقات زائد از پچاس برس قبل ۱۹۶۳ میں ہوئی تھی۔ اناج کے بڑھتے داموں کے خلاف احتجاجی مہم میں کسی نے تعارف کرایا تھا۔ یہ چند لفظوں کا تعارف دیرینہ رفاقت، باہمی اعتماد اور آپسی خلوص و محبت میں بدل گیا جو تادم مرگ روز اول کی طرح قائم و برقرار رہا اور آئندہ بھی ان کی ناقابل فراموش یادیں میرے دل و دماغ میں مہکتی رہیں گی۔

محلہ مغل پورہ ابتدا ہی سے شرفا کا محلہ کہلاتا رہا ہے۔ یہاں بڑے باکمال شعرا، ادبا، فنکاروں نے جنم لیا۔ یہ محلوں، ڈیوڑھیوں اور نوابوں کا محلہ اپنی نیک نامی، رعایا پروری، غربا نوازی کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریکوں، عوامی، ادبی، علمی، تہذیبی اور سماجی سرگرمیوں کے علاوہ قومی یک جہتی، آپسی بھائی چارہ، ہندو مسلم اتحاد اور گنگا جمنی تہذیب کا یگانہ روزگار رہا ہے۔ نصرت محی الدین کی تحریکی قیادت اور فعال سرگرمی یہاں کے باشعور اور بیدار مغز اور ترقی پسند نوجوانوں اور طالب علموں کے لیے سرچشمہ ہدایت بنی رہی۔ جشن آزادی ہو کہ یوم جمہوریہ

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: نیر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org